اکابر دیوبند کیا تھے؟

مفتی محمد تقی عثمانی

اکابر دیوبند کیا تھے؟

(۱/۲)

از: مولانا محمد تقی عثمانی
کراچی، پاکستان

اکابر دیوبند کیا تھے؟ اس کا جواب مختصر لفظوں میں یوں بھی دیا جاسکتا ہے کہ وہ خیرالقرون کی یادگار تھے، سلف صالحین کا نمونہ تھے، اسلامی مزاج و مذاق کی جیتی جاگتی تصویر تھے، لیکن ان مختصر جملوں کی تشریح وتفصیل کرنے بیٹھیں تو اس کے لیے دفتر کے دفتر بھی ناکافی ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی خصوصیات کو لفظوں میں سمیٹنا مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن ہے۔ اس لیے کہ ان کی خصوصیات کا تعلق درحقیقت اس مزاج و مذاق سے ہے جو صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم) کی سیرتوں اور اُن کے طرزِ زندگی سے مستنیر تھا اور مزاج و مذاق وہ چیز ہے جسے محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن الفاظ کے ذریعے ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح گلاب کی خوشبو کو سونگھا تو جاسکتا ہے لیکن اس کی پوری کیفیت کو الفاظ میں ڈھالنا ممکن نہیں۔ اسی طرح اُن حضرات کے مزاج و مذاق کو ان کی صحبتوں اور ان کے واقعات سے سمجھا جاسکتا ہے مگر اس کی منطقی تعبیر ناممکن ہے۔

لہٰذا اس مضمون میں اکابر دیوبند کی خصوصیات و امتیازات کو نظری طور سے بیان کرنے کے بجائے اُن کے چند متفرق واقعات سنانے مقصود ہیں جن سے ان کی خصوصیات زیادہ واضح اور آسان طریقے سے سمجھ میں آسکیں گی... وباللہ التوفیق!

علم وفضل اور اُس کے ساتھ تواضع وللّٰہیت

اگر صرف وسعت مطالعہ، قوتِ استعداد اور کثرتِ معلومات کا نام علم ہو تو یہ صفت آج بھی ایسی کمیاب نہیں لیکن اکابر دیوبند کی خصوصیت یہ ہے کہ علم وفضل کے سمندر سینے میں جذب کرلینے کے باوجود اُن کی تواضع، فنائیت اور للّٰہیت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ یہ محاورہ زبان زدِ عام ہے کہ ''پھلوں سے لدی ہوئی شاخ ہمیشہ جھکتی ہے'' لیکن ہمارے زمانے میں اس محاورے کا عملی مظاہرہ جتنا اکابر دیوبند کی زندگی میں نظر آتا ہے اور کہیں نہیں ملتا۔ چند واقعات ملاحظہ فرمائیے:

۱- بانیٔ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم بحر ناپیدا کنار تھے۔ اُن کی تصانیف آبِ حیات، تقریر دلپذیر، قاسم العلوم اور مباحثہ شاہجہاں پور وغیرہ سے اُن کے مقامِ بلند کا کچھ اندازہ ہوتا ہے اور ان میں سے بعض تصانیف تو ایسی ہیں کہ اچھے اچھے علماء کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ حد یہ ہے کہ ان کے ہم عصر بزرگ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ کا یہ جملہ دارالعلوم میں معروف تھا کہ ''میں نے آبِ حیات کا چھ مرتبہ مطالعہ کیا ہے، اب وہ کچھ کچھ سمجھ میں آئی ہے۔''

اور حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ فرماتے ہیں کہ:

''اب بھی مولانا (نانوتویؒ) کی تحریریں میری سمجھ میں نہیں آتیں اور زیادہ غور وخوض کی مشقت مجھ سے برداشت ہوتی نہیں، اس لیے مستفید ہونے سے محروم رہتا ہوں اور اپنے دل کو یوں سمجھالیتا ہوں کہ ضروریات کا علم حاصل کرنے کے لیے اور سہل سہل کتابیں موجود ہیں پھر کیوں مشقت اٹھائی جائے''۔(۱)

ایسے وسیع وعمیق علم کے بعد، بالخصوص جب کہ اس پر عقلیات کا غلبہ ہو، عموماً علم وفضل کا زبردست پندار پیدا ہوجایا کرتا ہے لیکن حضرت نانوتویؒ کا حال یہ تھا کہ خود فرماتے ہیں:

''جس طرح صوفیوں میں بدنام ہوں اسی طرح مولویت کا دھبہ بھی مجھ پر لگا ہوا ہے، اس لیے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے، اگر یہ مولویت کی قید نہ ہوتی تو قاسم کی خاک کا بھی پتہ نہ چلتا۔''(۲)

چنانچہ اُن کی بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ بقول مولانا احمد حسن صاحب امروہوی رحمۃ اللہ علیہ:

''حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ جس طالب علم کے اندر تکبر دیکھتے تھے اُس سے کبھی کبھی جوتے اُٹھوایا کرتے تھے اور جس کے اندر تواضع دیکھتے تھے اُس کے جوتے خود اُٹھالیا کرتے تھے''۔(۳)

۲- یہی حال حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ انھیں اُنکے تفقّہ کے مقامِ بلند کی بناء پر حضرت مولانا نانوتویؒ نے ''ابوحنیفۂ عصر'' کا لقب دیا تھا اور وہ اپنے عہد میں اسی لقب سے معروف تھے۔ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ جیسے بلند پایہ محقق جو علامہ شامیؒ کو ''فقیہ النفس'' کا مرتبہ دینے کے لیے تیار نہ تھے، حضرت گنگوہیؒ کو ''فقیہ النفس'' فرمایا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ واقعہ سناتے ہیں کہ:

''حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ حدیث کا سبق پڑھا رہے تھے کہ بارش آگئی۔ سب طلبہ کتابیں لے کر اندر کو بھاگے مگر مولاناؒ سب طلباء کی جوتیاں جمع کر رہے تھے کہ

اُٹھا کرلے چلیں۔لوگوں نے یہ حالت دیکھی تو کٹ گئے“ (۴)

۳- شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کے علم وفضل کا کیا ٹھکانا؟ لیکن حضرت تھانویؒ راوی ہیں کہ ”ایک مرتبہ مرادآباد تشریف لے گئے تو وہاں کے لوگوں نے وعظ کہنے کے لیے اصرار کیا۔مولاناؒ نے عذر فرمایا کہ مجھے عادت نہیں ہے مگر لوگ نہ مانے تو اصرار پر وعظ کے لیے کھڑے ہوگئے اور حدیث ”فقيه واحد أشدّ على الشيطٰن من ألف عابد“ پڑھی اور اس کا ترجمہ یہ کیا کہ:

”ایک عالم شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ بھاری ہے۔“

مجمع میں ایک مشہور عالم موجود تھے۔انھوں نے کھڑے ہوکر کہا کہ: ”یہ ترجمہ غلط ہے اور جس کو ترجمہ بھی صحیح کرنا نہ آوے اس کو وعظ کہنا جائز نہیں۔“

حضرت شیخ الہندؒ کا جوابی ردِّعمل معلوم کرنے سے پہلے ہمیں چاہیے کہ ذرا دیر گریبان میں منہ ڈال کر سوچیں کہ اگر اُن کی جگہ ہم ہوتے تو کیا کرتے؟ ترجمہ صحیح تھا اور اُن صاحب کا اندازِ بیان توہین آمیز ہی نہیں، اشتعال انگیز بھی تھا۔لیکن اس شیخ وقت کا طرزِ عمل سنیے، حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ یہ سن کر:

”مولانا فوراً بیٹھ گئے اور فرمایا کہ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ مجھے وعظ کی لیاقت نہیں ہے مگر ان لوگوں نے نہیں مانا۔خیر اب میرے پاس عذر کی دلیل بھی ہوگئی، یعنی آپ کی شہادت۔“

چنانچہ وعظ تو پہلے ہی مرحلے پر ختم فرمادیا، اس کے بعد اُن عالم صاحب سے بطرزِ استفادہ پوچھا کہ ”غلطی کیا ہے؟ تاکہ آئندہ بچوں“ انھوں نے فرمایا کہ أشدّ کا ترجمہ أثقل (زیادہ بھاری) نہیں بلکہ أضرّ (زیادہ نقصان دہ) کا آتا ہے۔“ مولاناؒ نے برجستہ فرمایا کہ ”حدیث وحی میں ہے يأتيني مثل صلصلة الجرس وهو أشدّ عليّ“ (کبھی مجھ پر وحی گھنٹیوں کی آواز کی طرح آتی ہے اور وہ مجھ پر سب سے زیادہ بھاری ہوتی ہے) کیا یہاں بھی أضرّ (زیادہ نقصان دہ) کے معنی ہیں؟ اس پر وہ صاحب دم بخود رہ گئے۔(۵)

۴-حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ جب کانپور میں مدرس تھے، انھوں نے مدرسہ کے جلسہ کے موقع پر اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کو بھی مدعو کیا، کانپور میں بعض اہل علم معقولات کی مہارت میں معروف تھے اور کچھ بدعات کی طرف بھی مائل تھے۔ادھر علمائے دیوبند کی زیادہ توجہ چونکہ خالص دینی علوم کی طرف رہتی تھی، اس لیے یہ حضرات یوں سمجھتے تھے کہ علمائے دیوبند کو معقولات میں کوئی درک نہیں ہے۔حضرت تھانویؒ اُس وقت نوجوان تھے اور اُن کے دل

میں حضرت شیخ الہندؒ کو مدعو کرنے کا ایک داعیہ یہ بھی تھا کہ یہاں حضرتؒ کی تقریر ہوگی تو کانپور کے ان علماء کو پتہ چلے گا کہ علمائے دیوبند کا علمی مقام کیا ہے؟ اور وہ منقولات و معقولات دونوں میں کیسی کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ جلسہ منعقد ہوا اور حضرت شیخ الہندؒ کی تقریر شروع ہوئی، حسن اتفاق سے تقریر کے دوران کوئی معقولی مسئلہ زیر بحث آ گیا۔ اس وقت تک وہ علماء جن کو حضرت تھانویؒ شیخ الہندؒ کی تقریر سنانا چاہتے تھے، جلسہ میں نہیں آئے تھے۔ جب حضرتؒ کی تقریر شباب پر پہنچی اور اُس معقولی مسئلہ کا انتہائی فاضلانہ بیان ہونے لگا تو وہ علماء تشریف لے آئے جن کا حضرت تھانویؒ کو انتظار تھا۔ حضرت تھانویؒ اس موقع پر بہت مسرور ہوئے کہ اب ان حضرات کو شیخ الہندؒ کے علمی مقام کا اندازہ ہوگا۔ لیکن ہوا یہ کہ جونہی حضرت شیخ الہندؒ نے اُن علماء کو دیکھا۔ تقریر کو مختصر کر کے فوراً ختم کر دیا اور بیٹھ گئے۔ حضرت مولانا فخرالحسن صاحب گنگوہیؒ موجود تھے، انھوں نے یہ دیکھا تو تعجب سے پوچھا کہ:

''حضرت! اب تو تقریر کا اصل وقت آیا تھا، آپ بیٹھ کیوں گئے؟''

شیخ الہندؒ نے جواب دیا: ''ہاں! دراصل یہی خیال مجھے بھی آ گیا تھا۔''

حضرت علیؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ کسی یہودی نے ان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی گستاخی کر دی تھی تو وہ اس پر چڑھ دوڑے اور اُسے زمین پر گرا کر اس کے سینے پر سوار ہو گئے۔ یہودی نے جو اپنے آپ کو بے بس پایا تو کھسیانا ہو کر اُس نے حضرت علیؓ کے روئے مبارک پر تھوک دیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ حضرت علیؓ اُس کو چھوڑ کر فوراً الگ ہو گئے اور پوچھنے پر بتایا کہ میں پہلے آنحضرت ﷺ کی محبت کی بناء پر اس یہودی سے اُلجھا تھا۔ اگر تھوکنے کے بعد کوئی اور کارروائی کرتا تو یہ اپنے نفس کی مدافعت ہوتی۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے اس عمل سے حضرت علیؓ کی یہ سنت تازہ فرما دی۔ مطلب یہی تھا کہ اب تک تو تقریر نیک نیتی سے خالص اللہ کے لیے ہو رہی تھی لیکن یہ خیال آنے کے بعد اپنا علم جتانے کے لیے ہوتی، اس لیے اسے روک دیا۔ (۶)

۵- مدرسہ معینیہ اجمیر کے معروف عالم حضرت مولانا محمد معین الدین صاحب معقولات کے مسلّم عالم تھے۔ انھوں نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کی شہرت سن رکھی تھی، ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا تو ایک مرتبہ دیوبند تشریف لائے اور حضرت شیخ الہندؒ کے مکان پر پہنچ گئے۔ گرمی کا موسم تھا۔ وہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو صرف بنیان اور تہبند پہنے ہوئے تھے۔ مولانا معین الدین صاحبؒ نے اُن سے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ ''مجھے حضرت مولانا

محمود حسن صاحبؒ سے ملنا ہے'' وہ صاحب بڑے تپاک سے مولانا اجمیریؒ کو اندر لے گئے، آرام سے بٹھایا اور کہا کہ ''ابھی ملاقات ہوجاتی ہے'' مولانا اجمیریؒ منتظر رہے، اتنے میں وہ شربت لے آئے اور مولانا کو پلایا۔ اس کے بعد مولانا اجمیری نے کہا کہ ''حضرت مولانا محمود حسن صاحب کو اطلاع دیجیے'' اُن صاحب نے فرمایا ''آپ بےفکر رہیں اور آرام سے تشریف رکھیں'' تھوڑی دیر بعد وہ صاحب کھانا لے آئے اور کھانے پر اصرار کیا، مولانا اجمیریؒ نے کہا کہ ''میں مولانا محمود حسن صاحب سے ملنے آیا ہوں، آپ اُنھیں اطلاع کردیجیے''۔ ان صاحب نے فرمایا ''اُنھیں اطلاع ہوگئی ہے آپ کھانا تناول فرمائیں ابھی ملاقات ہوجاتی ہے'' مولانا اجمیریؒ نے کھانا کھالیا تو اُن صاحب نے اُنھیں پنکھا جھلنا شروع کردیا۔ جب دیر گزر گئی تو مولانا اجمیریؒ برہم ہوگئے اور فرمایا کہ آپ میرا وقت ضائع کررہے ہیں، میں مولانا سے ملنے آیا تھا اور اتنی دیر ہوچکی ہے، ابھی تک آپ نے اُن سے ملاقات نہیں کرائی۔ اس پر وہ صاحب بولے کہ:

''دراصل بات یہ ہے کہ یہاں مولانا تو کوئی نہیں۔ البتہ محمود خاکسار ہی کا نام ہے۔''

مولانا معین الدین صاحب یہ سن کر ہکا بکا رہ گئے اور پتہ چل گیا کہ حضرت شیخ الہندؒ کیا چیز ہیں؟'' (۷)

۶-امام العصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ علم وفضل میں یکتائے روزگار تھے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے اپنی ایک مجلس میں نقل کیا کہ ایک عیسائی فیلسوف نے لکھا ہے کہ ''اسلام کی حقانیت کی ایک دلیل یہ ہے کہ غزالیؒ جیسا محقق اور مدقق اسلام کو حق سمجھتا ہے۔'' یہ واقعہ بیان کرکے حکیم الامتؒ نے فرمایا: ''میں کہتا ہوں کہ میرے زمانہ میں مولانا انور شاہ صاحب کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے کہ ایسا محقق اور مدقق عالم اسلام کو حق سمجھتا ہے اور اس پر ایمان رکھتا ہے۔'' (۸)

انہی حضرت شاہ صاحبؒ کا واقعہ حضرت مولانا محمد انوری صاحبؒ بیان فرماتے ہیں کہ مقدمہ بہاولپور کے موقع پر جب حضرت شاہ صاحبؒ نے قادیانیوں کے کفر پر بےنظیر تقریر فرمائی اور اس میں یہ بھی فرمایا کہ ''جو چیز دین میں تواتر سے ثابت ہو اُس کا منکر کافر ہے'' تو قادیانیوں کے گواہ نے اس پر اعتراض کیا:

''آپ کو چاہیے کہ امام رازیؒ پر کفر کا فتویٰ دیں کیونکہ فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت میں علامہ بحر العلومؒ نے لکھا ہے کہ امام رازیؒ نے متواتر معنوی انکار کیا ہے۔''

اس وقت بڑے بڑے علماء کا مجمع تھا، سب کو پریشانی ہوئی کہ فواتح الرحموت اس وقت پاس

نہیں ہے، اس اعتراض کا جواب کس طرح دیا جائے؟ مولانا محمد انوریؒ جو اس واقعے کے وقت موجود تھے، فرماتے ہیں:

''ہمارے پاس اتفاق سے وہ کتاب نہ تھی۔ مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مظاہر العلوم سہارنپور اور مولانا مرتضی حسن صاحبؒ حیران تھے کہ کیا جواب دیں گے؟''

لیکن اسی حیرانی کے عالم میں حضرت شاہ صاحبؒ کی آواز گونجی: ''جج صاحب! لکھیے، میں نے بتیس سال ہوئے، یہ کتاب دیکھی تھی، اب ہمارے پاس یہ کتاب نہیں ہے۔ امام رازیؒ دراصل یہ فرماتے ہیں کہ حدیث لاتجتمع امتی علی الضلالۃ تواتر معنوی کے رُتبے کو نہیں پہنچی، لہٰذا انھوں نے اس حدیث کے متواتر معنوی ہونے کا انکار فرمایا ہے، نہ کہ تواتر معنوی کے حجت ہونے کا۔ ان صاحب نے حوالہ پیش کرنے میں دھوکے سے کام لیا ہے۔ ان کو کہو کہ عبارت پڑھیں۔ ورنہ میں ان سے کتاب لے کر عبارت پڑھتا ہوں۔''

چنانچہ قادیانی شاہد نے عبارت پڑھی۔ واقعی اس کا مفہوم وہی تھا جو حضرت شاہ صاحبؒ نے بیان فرمایا۔ مجمع پر سکتہ طاری ہوگیا اور حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:

''جج صاحب! یہ صاحب ہمیں مُفحَم (لاجواب) کرنا چاہتے ہیں۔ میں چونکہ طالب علم ہوں، میں نے دو چار کتابیں دیکھ رکھی ہیں، میں ان شاء اللہ مُفحَم نہیں ہونے کا۔''(۹)

ایک طرف علم و فضل اور قوت حافظہ کا یہ محیر العقول کارنامہ دیکھیے کہ بتیس سال پہلے دیکھی ہوئی کتاب کا ایک جزوی حوالہ کتنی جزرسی کے ساتھ یاد رہا، دوسری طرف اس موقع پر کوئی اور ہوتا تو نہ جانے کتنے بلند بانگ دعوے کرتا، لیکن خط کشیدہ جملہ ملاحظہ فرمائیے کہ وہ تواضع کے کس مقام کی غمازی کر رہا ہے؟ اور یہ محض لفظ ہی نہیں ہیں، وہ واقعتاً اپنے تمام کمالات کے باوصف اپنے آپ کو ایک معمولی طالب علم سمجھتے تھے اور اس دعائے نبویؐ کے مظہر تھے کہ اللّٰھم اجعلنی فی عینی صغیرا وفی أعین النّاس کبیرا.

۶- حضرت مولانا محمد انوریؒ ہی راوی ہیں کہ ایک دفعہ حضرت شاہ صاحبؒ کشمیر تشریف لے جا رہے تھے، بس کے انتظار میں سیالکوٹ اڈّے پر تشریف فرما تھے، ایک پادری آیا اور کہنے لگا کہ آپ کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں کے بڑے عالم دین ہیں۔ فرمایا ''نہیں! میں طالب علم ہوں'' اس نے کہا '' آپ کو اسلام کے متعلق علم ہے؟'' فرمایا '' کچھ کچھ'' پھر اُن کی صلیب کے متعلق فرمایا کہ ''تم غلط سمجھے ہو۔ اس کی یہ شکل نہیں ہے۔'' پھر نبی کریم ﷺ کی نبوت پر چالیس دلائل دیے۔ دس قرآن سے دس تورات سے، دس انجیل سے اور دس عقلی۔ وہ پادری آپ

کی تقریر سن کر کہنے لگا کہ اگر مجھے اپنے مفادات کا خیال نہ ہوتا تو میں مسلمان ہو جاتا، نیز یہ کہ مجھے خود اپنے مذہب کی بہت سی باتیں آپ سے معلوم ہوئیں۔(۱۰)

۷- احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے بار بار یہ واقعہ بیان فرمایا کہ جب میں دارالعلوم دیوبند میں ملاحسن پڑھتا تھا تو ایک روز اس کی عبارت پر کچھ شبہ ہوا جو حل نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ حضرت شاہ صاحبؒ سے اس کے بارے میں استفسار کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں کتاب لے کر ان کی تلاش میں نکلا، وہ اپنی جگہ پر نہیں تھے اور جب وہ اپنی جگہ پر نہ ہوں تو ان کا کتب خانہ میں ہونا متعین تھا۔ میں کتب خانہ میں پہنچا تو وہ کتب خانے کی بالائی گیلری میں بیٹھے مطالعہ میں مشغول تھے۔ میں ابھی نیچے ہی تھا کہ انھوں نے مجھے دیکھ لیا اور اوپر ہی سے میرے آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے عرض کیا کہ ''ملاحسن کے ایک مقام پر کچھ اشکال ہے وہ سمجھنا تھا۔'' وہیں بیٹھے بیٹھے فرمایا ''عبارت پڑھیے'' میں نے عبارت پڑھنی شروع کی تو بیچ ہی میں روک کر فرمایا: ''اچھا! یہاں آپ کو یہ شبہ ہوا ہوگا'' اور پھر بعینہٖ وہی اشکال دُہرادیا جو میرے دل میں تھا۔ میں نے تصدیق کی کہ واقعی یہی شبہ ہے، اس پر انھوں نے اس کے جواب میں وہیں سے ایسی تقریر فرمائی کہ تمام اشکال کافور ہو گئے۔

اب ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ عرصہ دراز سے حدیث کی تدریس میں مصروف تھے اور منطق کی کتابوں سے واسطہ تقریباً ختم ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود یہ حافظہ اور یہ استحضار کرشمۂ قدرت نہیں تو اور کیا ہے؟

۸- احقر نے اپنے والد ماجد سے بھی سنا ہے اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مدظلہم سے بھی کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے ۱۳۲۱ھ میں علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ کی مشہور شرح ہدایہ ''فتح القدیر'' اور اس کے تکملہ کا مطالعہ بیس سے کچھ زائد ایام میں کیا تھا اور کتاب الحج تک اس کی تلخیص لکھی تھی اور انھوں نے صاحب ہدایہ پر جو اعتراضات کیے ہیں اُن کا جواب بھی لکھا تھا۔ اس کے بعد مدت العمر ''فتح القدیر'' کی مراجعت کی ضرورت نہیں پڑی اور کسی تازہ مطالعہ کے بغیر اس کی نہ صرف باتوں بلکہ طویل عبارتوں تک کا حوالہ سبق میں دیا کرتے تھے۔ حضرت مولانا بنوری مدظلہم فرماتے ہیں کہ انھوں نے ۱۳۴۷ھ میں ہم سے یہ واقعہ بیان کیا اور فرمایا:

''چھبیس سال ہوئے پھر مراجعت کی ضرورت نہیں پڑی اور جو مضمون اس کا بیان کروں گا، اگر مراجعت کرو گے تفاوت کم پاؤ گے۔''(۱۱)

۹- حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہم حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگرد ہیں۔ وہ

فرماتے ہیں کہ درس سے فراغت کے بعد میں جب بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو پہلے سے لکھے ہوئے متعدد سوالات کے جواب اُن سے معلوم کیا کرتا تھا۔ایک دفعہ کی حاضری میں ترمذی شریف کی ایک عبارت کا حوالہ میں نے دیا اور عرض کیا کہ اس عبارت میں یہ اشکال ہے، بہت غور کیا لیکن حل نہیں ہوسکا۔فرمایا ''مولوی صاحب! آپ کو یاد نہیں رہا، مجھے خوب یاد ہے کہ جس سال آپ دورہ میں تھے اس موقع پر میں نے بتایا تھا کہ یہاں ترمذی کے اکثر نسخوں میں ایک غلطی واقع ہوگئی ہے لیکن لوگ سرسری طور پر گزر جاتے ہیں اور انھیں پتہ نہیں چلتا، ورنہ یہ اشکال سب کو پیش آنا چاہیے'' پھر فرمایا کہ ''صحیح عبارت اس طرح ہے'' مولانا نعمانی مدظلہم لکھتے ہیں:

''اللہ اکبر! یہ بات بھی یاد رہتی تھی کہ فلاں سال اس موقع پر سبق میں یہ بات فرمائی تھی''۔(۱۲)

۱۰-حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم فرماتے ہیں کہ مجھے اپنی ایک تصنیف کے سلسلہ میں ابوالحسن کذاب کے حالات کی ضرورت تھی۔ مجھے ان کی تاریخ نہ ملی۔ چنانچہ میں حسب معمول حضرت شاہ صاحبؒ کے درِ دولت پر پہنچ گیا۔اس وقت مرضِ وفات اپنی آخری حد پر پہنچ چکا تھا اور دو تین ہفتے بعد وصال ہونے والا تھا۔کمزور بے حد ہوچکے تھے۔ابتدائی گفتگو کے بعد میں نے آنے کی غرض بتائی تو انھوں نے فرمایا کہ ادب اور تاریخ کی کتابوں میں فلاں فلاں مواقع کا مطالعہ کرلیجیے اور تقریباً آٹھ دس کتابوں کے نام لے دیے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! مجھے تو کتابوں کے اتنے اسماء یاد بھی نہ رہیں گے۔ نیز انتظامی مہمات کے بکھیڑوں میں اتنی فرصت بھی نہیں کہ چند جزوی مثالوں کے لیے اتنا طویل وعریض مطالعہ کروں۔ بس آپ ہی اس شخص کی دروغ گوئی کے متعلقہ واقعات کی دوچار مثالیں بیان فرمادیں، میں اُنھی کو آپ کے حوالہ سے جزوِ کتاب بنادوں گا۔اس پر مسکرا کر ابوالحسن کذاب کی تاریخ، اُس کے سن ولادت سے سن وار بیان فرمانی شروع کردی جس میں اس کے جھوٹ کے عجیب وغریب واقعات بیان فرماتے رہے۔آخر میں سن وفات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ شخص مرتے مرتے بھی جھوٹ بول گیا پھر اُس جھوٹ کی تفصیل بیان فرمائی۔

حیرانی یہ تھی کہ یہ بیان اس طرز سے ہورہا تھا کہ گویا حضرت ممدوح نے آج کی شب میں مستقلاً اسی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے جو اس بسط سے سن وار واقعات بیان فرمارہے ہیں چنانچہ میں نے تعجب آمیز لہجے میں عرض کیا کہ ''حضرت! شاید کسی قریبی زمانے ہی میں اس کی تاریخ دیکھنے کی نوبت آئی ہوگی؟'' سادگی سے فرمایا ''جی نہیں! آج سے تقریباً چالیس سال کا عرصہ ہوتا ہے جب میں مصر گیا ہوا تھا۔خدیوی کتب خانہ میں مطالعہ کے لیے پہنچا تو اتفاقاً اسی ابوالحسن کذاب کا ترجمہ سامنے آگیا

اوراس کا مطالعہ دیر تک جاری رہا، بس اسی وقت جو باتیں کتاب میں دیکھیں حافظہ میں محفوظ ہوگئیں اورآج آپ کے سوال پر مستحضر ہوگئیں جن کا میں نے اس وقت تذکرہ کیا''۔(۱۳)

۱۱- یہی حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم فرماتے ہیں کہ تحریک خلافت کے دور میں جب امارتِ شرعیہ (عوام کی طرف سے قاضی مقرر کرنے) کا مسئلہ چھڑا تو مولوی سبحان اللہ خاں صاحب گورکھپوری نے اپنے بعض نقاطِ نظر کی تائید میں بعض سلف کی عبارت پیش کی جوان کے نقطۂ نظر کی تو مؤید تھی مگر مسلک جمہور کے خلاف تھی۔ یہ عبارت وہ لے کر خود دیوبند تشریف لائے اور مجمع علماء میں اُسے پیش کیا۔ تمام اکابر دارالعلوم حضرت شاہ صاحبؒ کے کمرے میں جمع تھے۔ حیرانی یہ تھی کہ نہ اس عبارت کو ردّ ہی کرسکتے تھے کہ وہ سلف میں سے ایک بڑی شخصیت کی عبارت تھی اور نہ اُسے قبول ہی کرسکتے تھے کہ مسلک جمہور کے صراحتاً خلاف تھی۔ یہ عبارت اتنی واضح اور صاف تھی کہ اُسے کسی تاویل وتوجیہہ سے بھی مسلک جمہور کے مطابق نہیں کیا جاسکتا تھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ استنجا کے لیے تشریف لے گئے تھے وضو کرکے واپس ہوئے تو اکابر نے عبارت اور مسلک کے تعارض کا تذکرہ کیا اور یہ کہ ان دونوں باتوں میں تطبیق بن نہیں پڑتی۔ حضرت ممدوحؒ حسب عادت ''حسبنا اللہ'' کہتے ہوئے بیٹھ گئے اور عبارت کو ذرا غور سے دیکھ کر فرمایا کہ اس عبارت میں جعل اور تصرف کیا گیا ہے۔ اُسی وقت کتب خانہ سے کتاب منگائی گئی۔ دیکھا تو واقعی اصل عبارت میں سے پوری ایک سطر درمیان سے حذف ہوئی تھی۔ جونہی اس سطر کو عبارت میں شامل کیا گیا عبارت کا مطلب مسلک جمہور کے موافق ہوگیا اور سب کا تحیر رفع ہوگیا۔(۱۴)

۱۲-حضرت مولانا محمد یوسف بنوری مدظلہم فرماتے ہیں کہ طلاق کے ایک مسئلہ میں کشمیر کے علماء میں اختلاف ہوگیا۔ فریقین نے حضرت شاہ صاحبؒ کو حکم بنایا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے دونوں کے دلائل غور سے سنے۔ اُن میں سے ایک فریق اپنے موقف پر فتاویٰ عمّادیہ کی ایک عبارت سے استدلال کررہا تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:

''میں نے دارالعلوم کے کتب خانے میں فتاویٰ عمادیہ کے ایک صحیح قلمی نسخہ کا مطالعہ کیا ہے۔ اس میں یہ عبارت ہرگز نہیں ہے لہٰذا یا توان کا نسخہ غلط ہے یا یہ لوگ کوئی مغالطہ انگیزی کررہے ہیں۔''(۱۵)

ایسے علم وفضل اور ایسے حافظہ کا شخص اگر بلند بانگ دعوے کرنے لگے تو کسی درجہ میں اس کو حق پہنچ سکتا ہے، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ اُس قافلۂ رُشد وہدایت کے فرد تھے جس نے مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ کی حدیث کا عملی پیکر بن کر دکھایا تھا۔ چنانچہ اسی واقعہ میں جب انھوں نے حضرت مولانا بنوری مدظلہم کو اپنا فیصلہ لکھنے کا حکم دیا تو انھوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کے نام کے ساتھ

”الحبر البحر“ (عالم متبحر) کے دو تعظیمی لفظ لکھ دیے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے دیکھا تو قلم ہاتھ سے لے کر زبردستی خود یہ الفاظ مٹائے اور غصہ کے لہجہ میں مولانا بنوری سے فرمایا:

”آپ کو صرف مولانا محمد انور شاہ لکھنے کی اجازت ہے“۔(۱۶)

پھر ایسا شخص جو ہمہ وقت کتابوں ہی میں مستغرق رہتا ہو، اُس کا یہ جملہ ادب و تعظیم کتب کے کس مقام کی نشان دہی کرتا ہے کہ:

”میں مطالعہ میں کتاب کو اپنا تابع کبھی نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ خود کتاب کے تابع ہو کر مطالعہ کرتا ہوں۔“

چنانچہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم فرماتے ہیں:

”سفر و حضر میں ہم لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ لیٹ کر مطالعہ کر رہے ہوں یا کتاب پر کہنی ٹیک کر مطالعہ میں مشغول ہوں، بلکہ کتاب کو سامنے رکھ کر مؤدّب انداز میں بیٹھتے، گویا کسی شیخ کے آگے بیٹھے ہوئے استفادہ کر رہے ہوں۔“

اور یہ بھی فرمایا کہ:

”میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک دینیات کی کسی کتاب کا مطالعہ بے وضو نہیں کیا۔“ (۱۷)

۱۳- دارالعلوم کی تاریخ میں یہ جملہ بہت معروف ہے کہ دارالعلوم کی ابتداء دو ایسے بزرگوں سے ہوئی جن دونوں کا نام محمود تھا اور دونوں قصبۂ دیوبند کے باشندے تھے۔ ان میں شاگرد تو وہ محمود تھے جو شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کے نام سے معروف ہوئے اور استاد حضرت ملا محمود صاحبؒ تھے۔ راقم الحروف کے جد امجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ملا محمود صاحبؒ نے فرمایا کہ سنن ابن ماجہ پر جو حاشیہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ محدث دہلویؒ کے نام سے چھپا ہوا ہے اس کا بڑا حصہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ نے مجھ سے لکھوایا ہے۔ ان کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ طلباء نے اس پر تعجب کا اظہار کیا۔ وجہ یہ تھی کہ علم کے دعوے اور نام و نمود کی خواہشات سے اللہ تعالیٰ نے اس فرشتۂ خصلت بزرگ کو ایسا پاک رکھا تھا کہ عام آدمی کو یہ پہچاننا بھی مشکل تھا کہ یہ کوئی بڑے عالم ہیں۔

اپنا گھریلو سودا سلف اور گوشت ترکاری خود بازار سے خرید کر لاتے اور گھر میں عام آدمیوں کی طرح زندگی گزارتے تھے مگر علوم کے استحضار اور حفظ کا عالم یہ تھا کہ راقم کے جدِّ امجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ کی ایک بڑی کتاب (جو غالباً منطق یا اصولِ فقہ کی کتاب تھی) اتفاقاً درس

سے رہ گئی تھی، انھیں یہ فکر تھی کہ دورۂ حدیث شروع ہونے سے پہلے یہ کتاب پوری ہوجائے چنانچہ انھوں نے مُلاّ محمود صاحبؒ سے درخواست کی۔ ملا صاحبؒ نے فرمایا کہ اوقاتِ مدرسہ کے علاوہ بھی میرے تمام اوقات اسباق سے بھرے ہوئے ہیں، صرف ایک وقت ہے کہ جب میں گھر کا گوشت ترکاری لینے کے لیے بازار جاتا ہوں، یہ وقت خالی گزرتا ہے، تم ساتھ ہوجاؤ تو اس وقفے میں سبق پڑھادوں گا۔ احقر کے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ فرماتے تھے کہ کتاب بڑی اور مشکل تھی جس کو دوسرے علماء غور ومطالعہ کے بعد بھی مشکل سے پڑھا سکتے تھے۔ مگر مُلاّ محمود صاحبؒ نے کچھ راستہ میں کچھ قصاب کی دوکان پر یہ تمام کتاب ہمیں اس طرح پڑھادی کہ کوئی مشکل ہی نظر نہ آئی۔ (۱۸)

۱۴- حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے علم وفضل کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے، حضرتؒ طالب علمی کے زمانے ہی سے اپنی قوتِ استعداد، ذہانت وفطانت اور علم وعمل میں مصروف تھے لیکن جب ۱۳۰۰ھ میں آپ دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے، اور دستار بندی کے لیے دیوبند میں بہت بڑا اور شاندار جلسہ منعقد کرنے کی تجویز ہوئی تو حضرت تھانویؒ اپنے ہم سبقوں کو لے کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ ''حضرت! ہم نے سنا ہے کہ ہم لوگوں کی دستار بندی کی جائے گی اور سند فراغ دی جائے گی۔ حالانکہ ہم اس قابل ہرگز نہیں لہٰذا اس تجویز کو منسوخ فرمادیا جائے ورنہ اگر ایسا کیا گیا تو مدرسہ کی بڑی بدنامی ہوگی کہ ایسے نالائقوں کو سند دی گئی۔'' حضرت نانوتویؒ کو یہ سن کر جوش آگیا اور فرمایا کہ تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے، یہاں چونکہ تمہارے اساتذہ موجود ہیں اس لیے ان کے سامنے تمہیں اپنی ہستی کچھ نہیں آتی اور ایسا ہی ہونا چاہیے، باہر جاؤ گے تب تمہیں اپنی قدر معلوم ہوگی، جہاں جاؤ گے بس تم ہی تم ہوگے۔ (۱۹)

سادگی اور مخلوقِ خدا کا خیال

۱۵- حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار بھی اکابرِ دیوبند میں ہے۔ ان کے علم وفضل کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بلاواسطہ شاگرد اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلویؒ کے ہم سبق ہیں۔ وہ ایک مرتبہ کہیں تشریف لے جارہے تھے کہ راستہ میں ایک بوڑھا ملا جو بوجھ لیے جارہا تھا، بوجھ زیادہ تھا اور وہ بمشکل چل رہا تھا، حضرت مولانا مظفر حسین صاحبؒ نے یہ حال دیکھا تو اس سے وہ بوجھ لے لیا

اور جہاں وہ لے جانا چاہتا تھا وہاں پہنچادیا۔ اس بوڑھے نے اُن سے پوچھا! ''اجی! تم کہاں رہتے ہو؟'' انھوں نے کہا: ''بھائی! میں کاندھلہ میں رہتا ہوں''۔ اس نے کہا: ''وہاں مولوی مظفرحسین بڑے ولی ہیں'' اور یہ کہہ کران کی بڑی تعریفیں کیں، مگر مولاناؒ نے فرمایا: ''اور تو اس میں کوئی بات نہیں ہے، ہاں نماز تو پڑھ لے ہے''۔ اس نے کہا ''واہ میاں! تم ایسے بزرگ کو ایسا کہو؟'' مولاناؒ نے فرمایا: ''میں ٹھیک کہتا ہوں'' وہ بوڑھا اُن کے سرہوگیا، اتنے میں ایک اور شخص آ گیا جو مولاناؒ کو جانتا تھا، اس نے بوڑھے سے کہا ''بھلے مانس! مولوی مظفرحسین یہی ہیں'' اس پر وہ بوڑھا مولانا سے لپٹ کر رونے لگا۔ (۲۰)

۱۶- انہی مولانا مظفرحسین صاحبؒ کی عادت یہ تھی کہ اشراق کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا کرتے تھے اور اپنے تمام رشتہ داروں کے گھر تشریف لے جاتے جس کسی کو بازار سے کچھ منگانا ہوتا اس سے پوچھ کرلا دیتے اور طرّہ یہ کہ اس زمانے میں لوگوں کے پاس پیسے کم ہوتے تھے، عموماً چیزیں غلّے کے عوض خریدی جاتی تھیں چنانچہ آپ گھروں سے غلّہ باندھ کرلے جاتے اور اس سے اشیاءِ ضرورت خرید کرلاتے تھے۔ (۲۱)

۱۷- یہی حال دیوبند کے مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمٰن صاحبؒ کا تھا۔ علم وفضل کا تو یہ عالم کہ آج ان کی ''عزیز الفتاویٰ'' عہد حاضر کے تمام مفتیوں کے لیے مآخذ بنی ہوئی ہے اور فتویٰ کے ساتھ شغف کا یہ حال کہ وفات کے وقت بھی ایک استفتاء ہاتھ میں تھا جسے موت ہی نے ہاتھ سے چھڑا کر سینے پر ڈال دیا تھا۔ (۲۲) لیکن سادگی، تواضع اور خدمت خلق کا یہ مقام کا والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم تحریر فرماتے ہیں:

''کوئی کیسے سمجھے کہ یہ کوئی بڑے عالم یا صاحب کرامات صوفی اور صاحب نسبت شیخ ہیں جب کہ غایت تواضع کا یہ عالم ہو کہ بازار کا سودا سلف نہ صرف اپنے گھر کا بلکہ محلے کی بیواؤں اور ضرورت مندوں کا بھی خود لاتے، بوجھ زیادہ ہوجاتا تو بغل میں گٹھڑی دبا لیتے اور پھر ہر ایک کے گھر کا سودا مع حساب کے اس کو پہنچاتے۔'' (۲۳)

راقم الحروف نے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم ہی سے زبانی سنا کہ اسی سودا سلف لانے میں کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جب حضرت مفتی صاحبؒ کسی عورت کو سودا دینے کے لیے جاتے تو وہ دیکھ کر کہتی: ''مولوی صاحب! یہ تو آپ غلط لے آئے ہیں، میں نے یہ چیز اتنی نہیں اتنی منگائی تھی۔'' چنانچہ یہ فرشتہ صفت انسان دوبارہ بازار جاتا اور اس عورت کی شکایت دور کرتا۔

۱۸- حضرت مولانا سید اصغرحسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دیوبند میں حضرت میاں صاحبؒ

کے لقب سے معروف تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے درجہ علیاء کے استاد تھے، ان سے ابوداؤد پڑھنے والے اب بھی برصغیر میں ہزاروں ہوں گے، علومِ قرآن وسنت کے بہت بڑے ماہر اور جملہ علوم وفنون کے کامل محقق، مگر بہت کم گو، حدیث کے درس میں نہایت مختصر مگر جامع تقریر ایسی ہوتی تھی کہ حدیث کا مفہوم دل میں اُتر جائے اور شبہات خود بخود کافور ہوجائیں۔

انہی کا واقعہ ہے کہ آپ کا زنانہ مکان اور نشست گاہ کچی مٹی کی بنی ہوئی تھیں، ہر سال برسات کے مواقع پر اس کی لپائی پتائی ناگزیر تھی جس میں کافی پیسہ اور وقت خرچ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ راقم الحروف کے والد ماجد (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم) نے حضرت میاں صاحبؒ سے کہا کہ: ''حضرت! جتنا خرچ سالانہ اس کی لپائی پر کرتے ہیں، اگر ایک مرتبہ پختہ اینٹوں سے بنانے میں خرچ کرلیں تو دو تین سال میں یہ خرچ برابر ہوجائے اور ہمیشہ کے لیے اس محنت سے نجات ہو۔''

یہ سن کر پہلے تو فرمایا: ''ماشاء اللہ بات تو بہت عقل کی کہی، ہم بوڑھے ہوگئے ادھر دھیان ہی نہ آیا۔'' پھر کچھ توقف کے بعد جو حقیقت حال تھی وہ بتائی اور تب پتہ چلا کہ یہ حضرات کس مقام سے سوچتے تھے؟ فرمایا کہ:

''میرے پڑوس میں سب غریبوں کے کچے مکان ہیں، اگر میں اپنا مکان پکا بنوالوں تو غریب پڑوسیوں کو حسرت ہوگی اور اتنی وسعت نہیں کہ سب کے مکان پکے بناؤں''۔

حضرت والد صاحب مدظلہم تحریر فرماتے ہیں:

''اس وقت معلوم ہوا کہ یہ حضرات جو کچھ سوچتے ہیں وہاں تک ہر ایک کی رسائی نہیں ہوسکتی، چنانچہ انھوں نے اس وقت تک اپنے مکان کو پختہ نہیں کیا جب تک پڑوسیوں کے مکان پکے نہیں بن گئے۔'' (۲۴)

۱۹- انہی حضرت میاں صاحبؒ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت والد صاحب مدظلہم ان کے گھر تشریف لے گئے تو انھوں نے آموں سے تواضع کی جب آم چوس کر فارغ ہوگئے تو والد صاحب مدظلہم گٹھلیوں اور چھلکوں سے بھری ہوئی ٹوکری اُٹھا کر باہر پھینکنے کے لیے چلے، حضرت میاں صاحبؒ نے دیکھا تو پوچھا: ''یہ ٹوکری کہاں لے کر چلے''؟ عرض کیا: ''چھلکے باہر پھینکنے جارہا ہوں'' ارشاد ہوا ''پھینکنے آتے ہیں یانہیں''؟ والد صاحب نے کہا کہ ''حضرت! یہ چھلکے پھینکنا کون سا خصوصی فن ہے جسے سیکھنے کی ضرورت ہو؟'' فرمایا: ہاں! تم اس فن سے واقف نہیں، لاؤ، مجھے دو''، خود ٹوکری اُٹھا کر پہلے چھلکے گٹھلیوں سے الگ کیے، اس کے بعد باہر تشریف لائے اور سڑک کے

کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلے سے معین جگہوں پر چھلکے رکھ دیے اور ایک خاص جگہ گٹھلیاں ڈال دیں، والد صاحب کے استفسار پر ارشاد ہوا کہ: ''ہمارے مکان کے قرب وجوار میں تمام غربا، ومساکین رہتے ہیں، زیادہ تر وہی لوگ ہیں جن کو نانِ جویں بھی بمشکل ہی میسر آتی ہے، اگر وہ پھلوں کے چھلکے یکجا دیکھیں گے تو ان کو اپنی غریبی کا شدت سے احساس ہوگا اور بے مائیگی کی وجہ سے حسرت ہوگی اور اس ایذادہی کا باعث میں بنوں گا اس لیے متفرق کرکے ڈالتا ہوں اور وہ بھی ایسے مقامات پر جہاں جانوروں کے گلے گزرتے ہیں، یہ چھلکے ان کے کام آجاتے ہیں اور گٹھلیاں ایسی جگہ رکھی ہیں جہاں بچے کھیلتے کودتے ہیں، وہ ان گٹھلیوں کو بھون کر کھالیتے ہیں، یہ چھلکے اور گٹھلیاں بھی بہر حال ایک نعمت ہیں، اُن کو بھی ضائع کرنا مناسب نہیں۔'' راقم الحروف کے برادرِ مرحوم مولانا محمد زکی کیفی صاحب جو اس واقعے کے وقت موجود تھے تحریر فرماتے ہیں:

''یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنے کی ہے کہ میاں صاحبؒ خود تو شاید ہی کبھی کوئی آم چکھ لیتے ہوں، عموماً مہمانوں ہی کے لیے ہوتے تھے اور محلے کے غریب بچوں کو بلا بلا کر کھلانے میں استعمال ہوتے تھے، اس کے باوجود چھلکے گٹھلیوں کا یکجا ڈھیر کردینے سے گریز فرماتے تھے کہ غریبوں کی حسرت کا سبب نہ بن جائیں۔'' (۲۵) (باقی آئندہ)

حواشی:

(۱) اشرف السوانح ص:۱۳۶، ۱۳۷، ج۱۔ (۲) ارواحِ ثلاثہ، ص:۱۷۶، نمبر۲۳۰۔ (۳) ایضاً، ص:۲۰۶، نمبر ۲۸۸۔ (۴) ارواحِ ثلاثہ، ص:۲۸۶، نمبر۴۳۶۔ (۵) یہ واقعہ مذکورہ تفصیل کے ساتھ احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے سنا ہے اور انھوں نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب قدس سرہ سے اور اسی کا خلاصہ حضرت میاں صاحبؒ نے حیاتِ شیخ الہند، ص:۱۶۷ میں بھی کیا ہے۔ (۶) یہ واقعہ احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے سنا ہے اور انھوں نے اپنے ایک ہم سبق عالم مولانا مغیث الدین صاحب سے سنا تھا جو دیوبند سے فارغ ہوکر معقولات پڑھنے کے لیے اجمیر چلے گئے تھے اور آخر میں مدینہ طیبہ ہجرت کرگئے لیکن چونکہ واقعہ سنے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا تھا۔ اس لیے چند سال پہلے حضرت والد صاحب مدظلہم نے ان سے حرمِ نبوی ﷺ میں اس کی تصدیق فرمائی۔ (۷) حیاتِ انور، ص:۱۱۹ بروایت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ۔ (۸) انوارِ انوری، مؤلفہ مولانا محمد انوریؒ ص:۳۲۔ (۹) ایضاً، ص:۳۶۔ (۱۰) نفحۃ العنبر، ص:۲۷ طبع مجلس علمی کراچی۔ (۱۱) حیاتِ انور، ص:۱۳۹۔ (۱۲) حیاتِ انور، ص:۲۲۵ تا ۲۲۸۔ (۱۳) حیاتِ انور، ص:۲۲۹، ۲۳۰۔ (۱۴) نفحۃ العنبر، ص:۲۷۔ (۱۵) حیاتِ انور، ص:۲۳۳۔ (۱۶) حیاتِ انور، ص:۲۳۳۔ (۱۷) ''میرے والد ماجد'' مؤلفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم: ص۵۴، ۵۵۔ (۱۸) ارواحِ ثلاثہ، ص:۱۴۸، نمبر۱۸۸۔ (۱۹) ارواح ثلاثہ، ص:۱۵۳، نمبر۱۹۷۔ (۲۰) نقوش وتاثرات، مؤلفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم، ص:۳۴۔ (۲۱) مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، ج:۱، ص:۴۳۔ (۲۲) نقوش وتاثرات، ص:۴۰۔ (۲۳) ماہنامہ البلاغ کراچی۔ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ، ص:۳۸، ۳۹، ج:۱، مضمون ''حضرت میاں صاحبؒ''۔ (۲۴) ماہنامہ البلاغ کراچی۔ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ، ص:۳۹، ج:۱۔ (۲۵) یہ واقعہ احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے سنا ہے اور ان کو خود حضرت مولانا محمود صاحب رامپوری رحمۃ اللہ علیہ نے سنایا تھا۔

اکابر دیوبند کیا تھے؟

(۲/۳)

از: مولانا محمد تقی عثمانی
کراچی، پاکستان

۲۰- انہی حضرت میاں صاحبؒ کا معمول تھا کہ جو کھانا گھر سے آتا تھا، خود تو بہت کم خوراک کھاتے تھے باقی کھانا محلے کے بچوں کو کھلا دیتے تھے جو بوٹی بچ جائے اس کو بلی کے لیے دیوار پر رکھ دیتے اور جو ٹکڑے بچ جاتے ان کو چھوٹا چھوٹا کر کے چڑیوں کے لیے اور دسترخوان کے ریزوں کو بھی ایسی جگہ جھاڑتے تھے جہاں چیونٹیوں کا بل ہو۔(۲۶)

۲۱- شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے ان اساتذہ میں سے ہیں جن کے عشّاق اب بھی شاید لاکھوں سے کم نہ ہوں، ان کے رُعب اور دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ طلباء ان کے نام سے تھراتے تھے حالانکہ مارنے پیٹنے کا کوئی معمول نہ تھا۔ والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم بھی ان کے شاگرد ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان کے ساتھ ہم چند آدمی سفر پر روانہ ہوئے، سفر کے آغاز میں مولاناؒ نے فرمایا کہ ''کسی کو اپنا امیر بنالو'' ہم نے عرض کیا کہ ''امیر تو متعین ہے'' مولاناؒ نے فرمایا: ''مجھے امیر بنانا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے لیکن امیر کی اطاعت کرنی ہوگی''۔ ہم نے عرض کیا ''انشاء اللہ ضرور''! اب جو روانگی ہوئی تو مولاناؒ نے اپنا اور ساتھیوں کا سامان خود اُٹھالیا۔ ہم نے دوڑ کر سامان لینا چاہا تو فرمایا ''نہیں! امیر کی اطاعت ضروری ہے'' پھر سفر کے ہر مرحلے میں مشقت کا ہر کام خود کرنے کے لیے آگے بڑھتے اور کوئی کچھ بولتا تو اطاعت امیر کا حکم سناتے۔

۲۲- حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم مہتمم دارالعلوم دیوبند کے خسر محترم جناب مولانا محمود صاحب رامپوریؒ رامپور کے ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو اپنے دینی شغف اور دنیوی وجاہت وریاست دونوں کے اعتبار سے ممتاز تھا، اور تمام اکابر دیوبند سے اس کے تعلقات تھے، جب یہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے دیوبند آئے تو ان کا قیام دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد کے حجرے میں ہوا جو ''چھوٹی مسجد'' ہی کے نام سے معروف تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

دارالعلوم سے آتے جاتے ادھر ہی سے گزرا کرتے تھے ایک روز وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ وہاں مولانا محمود صاحب رامپوری کھڑے تھے، حضرت شیخ الہندؒ کو ان کے دیوبند آنے کا حال معلوم نہ تھا، اس لیے ان سے پوچھا کہ کب آئے؟ کیسے آئے؟ انھوں نے تفصیل بیان کی اور بتایا کہ اسی مسجد کے ایک حجرے میں مقیم ہوں۔ حضرتؒ حجرے کے اندر تشریف لے گئے اور ان کے رہنے کی جگہ دیکھی۔ وہاں ان کے سونے کے لیے ایک بستر فرش ہی پر بچھا ہوا تھا، اس وقت تو حضرتؒ یہ دیکھ کر تشریف لے آئے لیکن یہ خیال رہا کہ مولانا محمود صاحب رام پور کے رئیس زادے ہیں، انھیں زمین پر سونے کی عادت نہیں ہوگی اور یہاں تکلیف اُٹھاتے ہوں گے، چنانچہ گھر جاکر ایک چار پائی خود اُٹھائی اور اُسے لے کر چھوٹی مسجد کی طرف چلے، وہاں سے فاصلہ کافی تھا، لیکن حضرتؒ اسی حالت میں گلیوں اور بازار سے گزرتے ہوئے چھوٹی مسجد پہنچ گئے۔ اس وقت مولانا محمود صاحبؒ مسجد سے نکل رہے تھے۔ یہاں پہنچ کر حضرت شیخ الہندؒ کو خیال آیا کہ یہ مجھے چار پائی اُٹھائے ہوئے دیکھیں گے تو انھیں ندامت ہوگی کہ میری خاطر شیخ الہندؒ نے اتنی تکلیف اٹھائی، چنانچہ انھیں دیکھتے ہی چار پائی نیچے رکھ دی اور فرمایا:

''لو میاں! یہ اپنی چار پائی خود اندر لے جاؤ، میں بھی شیخ زادہ ہوں کسی کا نوکر نہیں'' (۲۷)

اِنابت وتقویٰ

۲۳- اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو انابت وتقویٰ کے ایسے سانچوں میں ڈھالا تھا کہ یہ ''سیماھم فی وجوھھم'' کی مثال بن گئے تھے، اور لوگ ان کے چہرے دیکھ کر اسلام قبول کرتے تھے۔ مولانا محمد انوریؒ فرماتے ہیں کہ مظفر گڑھ کے سفر میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، ملتان چھاؤنی کے اسٹیشن پر فجر کی نماز سے قبل حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ گاڑی کے انتظار میں تشریف فرما تھے، اردگرد خدام کا مجمع تھا، ریلوے کے ایک ہندو بابو صاحب لیمپ ہاتھ میں لیے آرہے تھے، حضرت شاہ صاحبؒ کا منور چہرہ دیکھ کر سامنے کھڑے ہوگئے اور زار وقطار رونے لگے اور پھر یہ زیارت ہی اُن کے ایمان کا ذریعہ بن گئی، وہ کہتے تھے کہ ''ان بزرگوں کا روشن چہرہ دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ اسلام سچا دین ہے۔'' (۲۸)

۲۴- تمام اکابر دیوبند کا مشترک رنگ یہ تھا کہ وہ حروف ونقوش کے کتابی علم کو اس وقت تک اہمیت نہیں دیتے تھے جب تک اس کے ساتھ انابت الی اللہ اور صلاح وتقویٰ نہ ہو، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے جب خانقاہ تھانہ بھون میں مدرسہ امدادیہ قائم

فرمایا تو حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کو اس کی اطلاع دی، حضرتؒ نے جواب میں تحریر فرمایا:

''اچھا ہے بھائی، مگر خوشی تو جب ہوگی جب یہاں اللہ اللہ کرنے والے جمع ہوجاویں گے'' (۲۹)

۲۵- چنانچہ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ہی انابت الی اللہ پر تھی، راقم الحروف کے جد امجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب قدس سرہ فرماتے تھے کہ:

''ہم نے دارالعلوم کا وہ وقت دیکھا ہے جس میں صدر مدرس سے لے کر ادنیٰ مدرس تک اور مہتمم سے لے کر دربان اور چپراسی تک سب کے سب صاحب نسبت بزرگ اور اولیاء اللہ تھے۔ دارالعلوم اس زمانہ میں دن کو دارالعلوم اور رات کو خانقاہ معلوم ہوتا تھا کہ اکثر حجروں سے آخر شب میں تلاوت اور ذکر کی آوازیں سنائی دیتی تھیں اور درحقیقت یہی اس دارالعلوم کا طغرائے امتیاز تھا۔'' (۳۰)

۲۶- دارالعلوم دیوبند کے دوسرے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحب قدس سرہ اگرچہ ضابطے کے عالم نہ تھے لیکن حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلویؒ کے خلیفہ اور اس درجے کے بزرگ تھے کہ حضرت نانوتویؒ نے ایک موقع پر فرمایا:

''مولانا رفیع الدین صاحبؒ اور حضرت مولانا گنگوہیؒ میں سوائے اس کے کوئی فرق نہیں کہ مولانا گنگوہیؒ عالم ہیں اور وہ عالم نہیں، ورنہ نسبت باطنی کے لحاظ سے دونوں ایک درجہ کے ہیں۔'' (۳۱)

ان کا واقعہ ہے کہ انھوں نے ایک گائے پال رکھی تھی جس کی دیکھ بھال ایک خادم کے سپرد تھی۔ ایک روز اتفاقاً وہ خادم کسی وجہ سے گائے کو مدرسہ کے صحن میں باندھ کر کسی کام سے چلا گیا۔ دیوبند کے باشندے کوئی صاحب ادھر آنکلے مولاناؒ کی گائے کو مدرسہ کے صحن میں دیکھا تو مولانا سے شکایت کی کہ ''کیا مدرسہ کا صحن آپ کی گائے پالنے کے لیے ہے''؟ مولاناؒ نے ان سے کوئی عذر بیان کرنے کے بجائے یہ گائے دارالعلوم ہی کو دے دی اور قصہ ختم کردیا، حالانکہ مولاناؒ کا عذر بالکل واضح اور ظاہر تھا، مگر یہ حضرات اپنے نفس کی طرف سے مدافعت کا پہلو اختیار ہی نہ کرتے تھے۔ (۳۲)

۲۷- حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے اس دور کے مہتمم تھے۔ جب دارالعلوم کا کام بہت زیادہ پھیل گیا تھا، طلباء کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز تھی۔ بہت سے نئے شعبے قائم ہوچکے تھے اور ان کا انتظام شبانہ روز مصروفیت کے بغیر ممکن نہ تھا لیکن احقر نے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے سنا ہے کہ اس دور میں بھی نماز اور تلاوت کے دیگر معمولات کے علاوہ روزانہ سوا لاکھ اسم ذات کا معمول کبھی قضا نہیں ہوتا تھا اور اللہ پر توکل کا عالم یہ تھا کہ ایک مرتبہ دارالعلوم کی انتظامیہ کے خلاف ایک شدید طوفان اُٹھا اور بعض

لوگ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کی جان کے بھی دشمن ہوگئے، ایسے حالات میں وہ رات کو دارالعلوم کی کھلی چھت پر تن تنہا سوتے تھے، بعض بہی خواہوں نے عرض کیا کہ ایسے حالات میں آپ کو اس طرح نہ سونا چاہیے بلکہ احتیاط کے مدنظر کمرے کے اندر سونا چاہیے۔ مولاناؒ نے جواب میں فرمایا کہ: میں تو اس باپ (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کا بیٹا ہوں جس کے جنازے کو چار اُٹھانے والے بھی میسر نہ آئے اور جسے رات کے اندھیرے میں بقیع کی نذر کیا گیا لہٰذا مجھے موت کی کیا پرواہ ہوسکتی ہے۔'' (۳۳)

یہ دیوبند کے وہ بزرگ ہیں جو خالص انتظامی کاموں میں مصروف تھے اور جیسا کہ انتظامی امور کا خاصہ ہے وہ بعض مرتبہ موردِ اعتراض بھی بنے اور عموماً اولیاء اللہ کی فہرست میں ان کا شمار نہیں ہوتا ع قیاس کن زگلستانِ من بہارمرا

۲۸- شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ سارا دن تعلیم وتدریس کی محنت اُٹھانے کے باوجود رات کو دو بجے بیدار ہوجاتے اور فجر تک نوافل وذکر میں مشغول رہتے تھے اور رمضان المبارک میں تو تمام رات جاگنے کا معمول تھا، حضرتؒ کے یہاں تراویح سحری سے ذرا پہلے تک جاری رہتی تھی اور مختلف حفاظ کئی کئی پارے سناتے تھے، یہاں تک کہ حضرتؒ کے پاؤں پر ورم آجاتا اور حتّٰی تورمت قدماہ کی سنت نبویہ ﷺ نصیب ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ خوراک اور نیند کی کمی اور طویل قیام کے اثر سے حضرتؒ کا ضعف بہت زیادہ ہوگیا، اس کے باوجود رات بھر کی تراویح کا یہ معمول ترک نہیں فرمایا۔ آخر مجبور ہوکر گھر کی خواتین نے تراویح کے امام مولوی کفایت اللہ صاحب سے کہلایا کہ آج کسی بہانے سے تھوڑا سا پڑھ کر اپنی طبیعت کے کسل اور گرانی کا عذر کردیجیے حضرتؒ کو دوسروں کی راحت کا بہت خیال رہتا تھا اس لیے خوشی سے منظور کرلیا۔ تراویح ختم ہوگئی اور اندر حافظ صاحب لیٹ گئے اور باہر حضرت شیخ الہندؒ لیکن تھوڑی دیر بعد حافظ صاحب نے محسوس کیا کہ کوئی شخص آہستہ آہستہ پاؤں دبارہا ہے، انھوں نے ہوشیار ہوکر دیکھا تو خود حضرت شیخ الہندؒ تھے۔ ان کی حیرت وندامت کا کچھ ٹھکانہ نہ رہا، وہ اُٹھ کر کھڑے ہوگئے لیکن مولاناؒ فرمانے لگے کہ: ''نہیں بھائی، کیا حرج ہے؟ تمہاری طبیعت اچھی نہیں، ذرا راحت آجائے گی۔'' (۳۴)

۲۹- حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ کے واقعات پہلے بھی آچکے ہیں، اُن کا علم وفضل اور حیرت انگیز حافظہ اس قدر مشہور ہوا کہ ان کی دوسری خوبیاں اس میں گم ہوگئیں ورنہ انابت وتقویٰ اور سلوک وتصوف میں بھی انھیں ممتاز مقام حاصل تھا۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہم سے

انھوں نے خود بیان فرمایا کہ ایک مرتبہ میں کشمیر سے آ رہا تھا۔ راستہ میں ایک صاحب مل گئے جو پنجاب کے ایک مشہور پیر کے مرید تھے، ان کی خواہش اور ترغیب یہ تھی کہ میں بھی اُن پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اتفاق سے وہ مقام میرے راستہ میں پڑتا تھا۔ اس لیے میں نے بھی ارادہ کرلیا۔ ہم پیر صاحب کے پاس پہنچے تو وہ بڑے اکرام سے پیش آئے، کچھ باتیں ہوئیں، پھر وہ مریدین کی طرف متوجہ ہوگئے اور اُن پر توجہ ڈالنی شروع کی جس سے وہ بے ہوش ہو ہو کر لوٹنے اور تڑپنے لگے۔ میں یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا ''میرا جی چاہتا ہے کہ اگر مجھ پر بھی یہ حالت طاری ہوسکے تو مجھ پر آپ توجہ فرمائیں''۔ انھوں نے توجہ دینی شروع کی اور میں اللہ تعالیٰ کے ایک اسم پاک کا مراقبہ کر کے بیٹھ گیا۔ بے چاروں نے بہت زور لگایا لیکن مجھ پر کچھ اثر نہ ہوا، کچھ دیر کے بعد انھوں نے خود فرمایا کہ آپ پر اثر نہیں پڑسکتا۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ بتاتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ واقعہ سنا کر غیر معمولی جوش کے ساتھ فرمایا:

''کچھ نہیں ہے، لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے ایک کرشمہ ہے۔ ان باتوں کا خدا رسیدگی سے کوئی تعلق نہیں، اگر کوئی چاہے اور استعداد ہو تو انشاء اللہ تین دن میں یہ بات پیدا ہوسکتی ہے کہ قلب سے اللہ اللہ کی آواز سنائی دینے لگے۔ لیکن یہ بھی کچھ نہیں۔ اصل چیز تو بس احسانی کیفیت اور شریعت وسنت پر استقامت ہے۔'' (۳۵)

تبلیغ ودعوت کا انداز

۳۰- اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو جہاں تبلیغ ودعوتِ دین کا جذبہ عطا فرمایا تھا وہاں اسے ''حکمت'' اور ''موعظہ حسنہ'' کے اصول پر انجام دینے کی توفیق بھی عطا فرمائی تھی۔ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلویؒ کا تذکرہ پہلے بھی آچکا ہے۔ ایک مرتبہ سفر کے دوران آپ کا گزر جلال آباد یا شاملی سے ہوا، وہاں ایک مسجد ویران پڑی تھی، آپ نے پانی کھینچ کر وضو کیا، مسجد میں جھاڑو دی اور بعد میں ایک شخص سے پوچھا کہ یہاں کوئی نمازی نہیں؟ اُس نے کہا کہ سامنے خان صاحب کا مکان ہے جو شرابی ہیں اور رنڈی باز ہیں، اگر وہ نماز پڑھنے لگیں تو یہاں اور بھی دو چار نمازی ہوجائیں۔

مولاناؒ یہ سن کر خان صاحب کے پاس تشریف لے گئے، وہ نشہ میں مست تھے اور رنڈی پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ مولاناؒ نے ان سے فرمایا: ''بھائی خان صاحب! اگر تم نماز پڑھ لیا کرو تو دو چار

آدمی اور جمع ہو جایا کریں اور یہ مسجد آباد ہو جائے۔'' خان صاحب نے کہا کہ مجھ سے وضو نہیں ہوتی اور نہ یہ دو بُری عادتیں چھوٹتی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ بے وضو ہی پڑھ لیا کرو اور شراب نہیں چھوٹتی تو وہ بھی پی لیا کرو۔ اس نے عہد کیا کہ میں بغیر وضو ہی پڑھ لیا کروں گا۔ آپ وہاں سے تشریف لے گئے، کچھ فاصلہ پر نماز پڑھی اور سجدے میں خوب روئے۔ ایک شخص نے دریافت کیا کہ حضرت! آپ سے دو باتیں ایسی سرزد ہوئیں جو کبھی نہ ہوئی تھیں، ایک یہ کہ آپ نے شراب اور زنا کی اجازت دے دی۔ دوسرے یہ کہ آپ سجدے میں بہت روئے۔ فرمایا کہ: ''سجدے میں میں نے جناب باری سے التجا کی تھی کہ اے ربّ العزت! کھڑا تو میں نے کر دیا، اب دل تیرے ہاتھ میں ہے۔'' چنانچہ ان خان صاحب کا یہ حال ہوا کہ جب رنڈیاں پاس سے چلی گئیں تو ظہر کا وقت تھا، اپنا عہد یاد آیا، پھر خیال آیا کہ آج پہلا دن ہے، لاؤ غسل کر لیں، کل سے بغیر وضو پڑھ لیا کریں گے۔ چنانچہ غسل کیا، پاک کپڑے پہنے اور نماز پڑھی۔ نماز کے بعد باغ کو چلے گئے۔ عصر اور مغرب باغ میں اسی وضو سے پڑھی، مغرب کے بعد گھر پہنچے تو ایک طوائف موجود تھی۔ پہلے کھانا کھانے گھر میں گئے۔ وہاں جو بیوی پر نظر پڑی تو فریفتہ ہو گئے۔ باہر آکر رنڈی سے کہا کہ آئندہ میرے مکان پر نہ آنا۔(۳۶)

۞ ۞ ۞

حواشی:

(۲۶) انوارِ انوری، ص:۴۰۔ (۲۷) ارواحِ ثلاثہ، ص:۲۲۴، نمبر ۳۲۷۔ (۲۸) ''میرے والد ماجد'': از حضرت مفتی محمد شفیع مدظلہم، ص:۵۲۔ (۲۹) اشرف السوانح، ج۱، ص:۱۳۹۔ (۳۰) ''میرے والد ماجد، ص:۶۰) (۳۱) یہ واقعہ احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے سنا ہے (م ت ع)۔ (۳۲) حیات شیخ الہندؒ از مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ ص۱۸۹۔ (۳۳) حیات انور، ص: ۱۵۵ تا ۱۵۷۔ (۳۴) ارواحِ ثلاثہ، ص:۱۵۰، ۱۵۱، نمبر ۱۹۱۔ (۳۵) ارواح ثلاثہ، ص:۱۷۴، نمبر ۲۲۶۔ (۳۶) ''میرے والد ماجد'' از حضرت مفتی محمد شفیع صاحب، ص:۵۹۔

اکابر دیوبند کیا تھے؟

(۳/۴)

از: مولانا محمد تقی عثمانی
کراچی، پاکستان

۳۱- امیر شاہ خان صاحب مرحوم راوی ہیں کہ جب منشی ممتاز علی کا مطبع میرٹھ میں تھا، اس زمانے میں ان کے مطبع میں مولانا نانوتویؒ بھی ملازم تھے اور ایک حافظ جی بھی نوکر تھے۔ یہ حافظ جی بالکل آزاد تھے، رندانہ وضع تھی، چوڑی دار پاجامہ پہنتے تھے، ڈاڑھی چڑھاتے تھے، نماز کبھی نہ پڑھتے تھے، مگر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے ان کی نہایت گہری دوستی تھی۔ وہ مولاناؒ کو نہلاتے اور کمر ملتے تھے۔ مولاناؒ ان کے کنگھا کرتے تھے اور وہ مولاناؒ کے کنگھا کرتے تھے۔ اگر کبھی مٹھائی وغیرہ مولاناؒ کے پاس آتی تو اُن کا حصہ ضرور رکھتے تھے، غرض بہت گہرے تعلقات تھے۔ مولاناؒ کے مقدس دوست ایسے آزاد شخص کے ساتھ مولاناؒ کی دوستی سے ناخوش تھے، مگر وہ اس کی کچھ پرواہ نہ کرتے تھے۔

ایک مرتبہ جمعہ کا دن تھا، حسب معمول مولاناؒ نے حافظ جی کو نہلایا، اور حافظ جی نے مولاناؒ کو۔ جب نہا چکے تو مولاناؒ نے فرمایا: حافظ جی! مجھ میں اور تم میں دوستی ہے اور یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ تمہارا رنگ اور ہو اور میرا رنگ اور، اس لیے میں بھی تمہاری ہی وضع اختیار کر لیتا ہوں، تم اپنے کپڑے لاؤ، میں بھی وہی کپڑے پہنوں گا اور میری یہ ڈاڑھی موجود ہے تم اس کو بھی چڑھا دو اور میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ نہ کپڑے اُتاروں گا نہ ڈاڑھی، وہ یہ سن کر آنکھوں میں آنسو بھر لائے، اور کہا کہ ”یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ مجھے اپنے کپڑے دیجیے، میں آپ کے کپڑے پہنوں گا اور یہ ڈاڑھی موجود ہے اس کو آپ اُتار دیں۔ چنانچہ مولاناؒ نے ان کو کپڑے پہنائے اور ڈاڑھی اُتار دی اور وہ اس روز سے پکے نمازی اور نیک وضع بن گئے۔ (۳۷)

۳۲- دارالعلوم دیوبند کے دوسرے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے محسوس کیا کہ بعض حضرات مدرسین دارالعلوم کے مقرّرہ وقت سے کچھ دیر میں آتے ہیں تو آپ نے حاکمانہ محاسبہ کے بجائے یہ معمول بنالیا کہ روزانہ صبح کو دارالعلوم

کا وقت شروع ہونے پر دارالعلوم کے دروازے کے قریب ایک چارپائی ڈال کر اس پر بیٹھ جاتے اور جب کوئی استاد آتے تو سلام ومصافحہ اور دریافت خیریت پر اکتفا فرماتے، زبان سے کچھ نہ کہتے کہ آپ دیر سے کیوں آئے ہیں؟ اس حکیمانہ سرزنش نے تمام مدرسین کو وقت کا پابند بنا دیا۔

البتہ صرف ایک مدرس اس کے بعد بھی کچھ دیر سے آتے تھے، ایک روز جب وہ وقت مقررہ کے کافی بعد مدرسہ میں داخل ہوئے تو سلام اور دریافت خیرت کے بعد اُنھیں پاس بٹھا کر فرمایا:

''مولانا! میں جانتا ہوں کہ آپ کے مشاغل بہت ہیں، ان کی وجہ سے دارالعلوم پہنچنے میں دیر ہوجاتی ہے، ماشاء اللہ آپ کا وقت بڑا قیمتی ہے اور میں ایک بے کار آدمی ہوں خالی پڑا رہتا ہوں، آپ ایسا کریں کہ اپنے گھریلو کام مجھے بتلا دیا کریں، میں خود جا کر ان کو انجام دے دیا کروں گا تا کہ آپ کا وقت تعلیم کے لیے فارغ ہوجائے۔''

اس حکیمانہ طرزِ خطاب کا جو اثر ہونا تھا وہ ہوا اور وہ مدرّس بھی آئندہ ہمیشہ کے لیے وقت کے پابند ہوگئے۔ (۳۸)

۳۳- حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کو اللہ تعالیٰ نے اس صدی میں اصلاحِ خلق کی توفیق خالص اور اس کا انتہائی حکیمانہ اسلوب مرحمت فرمایا تھا۔ اردو کے مشہور شاعر جناب جگر مرادآبادی مرحوم کا واقعہ ہے کہ ایک مجلس میں حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت تھانویؒ سے ذکر کیا کہ: ''جگر مرادآبادی سے ایک مرتبہ میری ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگے کہ تھانہ بھون جانے اور زیارت کرنے کو بہت دل چاہتا ہے مگر میں اس مصیبت میں مبتلا ہوں کہ شراب نہیں چھوڑ سکتا، اس لیے مجبور ہوں کہ کیا منہ لے کر وہاں جاؤں''؟ حضرتؒ نے خواجہ صاحبؒ سے پوچھا: ''پھر آپ نے کیا جواب دیا''؟ خواجہ صاحبؒ نے عرض کیا کہ میں نے کہہ دیا ''ہاں! یہ تو صحیح ہے، ایسی حالت میں بزرگوں کے پاس جانا کیسے مناسب ہوسکتا ہے''؟ حضرتؒ نے فرمایا: ''واہ خواجہ صاحب! ہم تو سمجھتے تھے کہ اب آپ طریق کو سمجھ گئے ہیں، مگر معلوم ہوا کہ ہمارا خیال غلط تھا''۔ خواجہ صاحبؒ کے تعجب پر حکیم الامت قدس سرہ نے فرمایا کہ ''آپ کہہ دیتے کہ جس حال میں ہو اسی میں چلے جاؤ، ممکن ہے کہ یہ ملاقات ہی اس بلا سے نجات کا ذریعہ بن جائے۔''

چنانچہ خواجہ صاحبؒ یہاں سے واپس گئے تو پھر اتفاقاً جگر صاحب سے ملاقات ہوگئی اور یہ سارا واقعہ جگر صاحب کو سنا دیا۔ انھوں نے حضرت کے یہ کلمات سن کر زار زار رونا شروع کر دیا اور بالآخر یہ عہد کرلیا کہ اب مر بھی جاؤں تو اس خبیث چیز کے پاس نہ جاؤں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ

شراب چھوڑنے سے بیمار پڑگئے، حالت نازک ہوگئی، اس وقت لوگوں نے کہا کہ آپ کو اس حالت میں بقدرِ ضرورت پینے کی تو شریعت بھی اجازت دے گی لیکن یہ جگر صاحب کا جگر تھا کہ اس کے باوجود انھوں نے اس اُمّ الخبائث کو ہاتھ نہ لگایا۔ اللہ تعالیٰ اہل عزم وہمت کی مدد فرماتے ہیں، اس وقت بھی حق تعالیٰ کی مدد سے چند روز ہی میں شفاءِ کامل حاصل ہوئی۔ اس کے بعد وہ تھانہ بھون تشریف لائے اور حضرت نے ان کا بڑا اکرام فرمایا۔(۳۹)

۳۴- غالباً شملہ کے کسی کالج میں حضرت تھانویؒ کا بیان ہوا، وہاں آپ نے فرمایا کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات کو جو شبہات پیدا ہوتے ہیں وہ صرف نصابِ تعلیم ہی کا قصور نہیں بلکہ اس کا بڑا سبب وہ لادینی ماحول ہے جس میں ہماری نئی نسل پلتی اور ڈھلتی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ بزرگ علماء وصلحاء کی مجلسیں بحمداللہ ہر جگہ کچھ نہ کچھ قائم ہیں، کچھ دن اس ماحول میں رہنے کی عادت ڈالیں۔

غالباً اسی مجلس میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ کو انگریزی پڑھنے والوں سے نفرت ہے؟ حضرتؒ نے فرمایا کہ ''ہرگز نہیں۔ ان لوگوں سے کوئی نفرت نہیں، البتہ ان کے بعض اعمال وافعال سے نفرت ہے جو شریعت کے خلاف ہیں'' یہ صاحب بولے ''وہ اعمال وافعال کیا ہیں''؟ حضرتؒ نے فرمایا کہ ''مختلف لوگوں کے مختلف اعمال ہیں، سب یکساں نہیں''۔ یہ صاحب بھی خوب آزاد آدمی تھے، کہنے لگے کہ ''مثلاً مجھ میں کیا ہیں''؟ آج کے عام وضع طلباء کی طرح ان کی بھی ڈاڑھی صاف تھی، حضرتؒ نے فرمایا: ''بعض چیزیں تو ظاہر ہیں، مگر مجمع میں اس کا اظہار کرنے سے حیا مانع ہے اور آپ کے باقی حالات ومعاملات مجھے معلوم نہیں جس پر کوئی رائے ظاہر کرسکوں''۔

یہ جلسہ ختم ہوا، حضرتؒ تھانہ بھون واپس آگئے پھر اتفاقاً کالج کی تعطیل ہوئی تو ایک طالب علم کا خط آیا، خط میں لکھا تھا کہ ہماری اس وقت تعطیل ہے، میں آپ کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق کچھ دن آپ کی خدمت میں رہنا چاہتا ہوں مگر میری ظاہری صورت بھی شریعت کے مطابق نہیں اور اعمال وافعال میں بھی بہت گڑبڑ ہے، ان حالات میں حاضری کی اجازت ہو تو میں حاضر ہوجاؤں، حضرت نے تحریر فرمایا ''جس حالت میں ہیں، چلے آئیں، کوئی فکر نہ کریں''۔ یہ صاحب آگئے اور عرض کیا کہ مجھے بہت سے شبہات واشکالات ہیں، ان کو حل کرنا چاہتا ہوں، حضرتؒ نے فرمایا کہ مناسب ہے مگر اس کی صورت یہ کرنی ہوگی کہ آپ کے جتنے شبہات ہیں ان سب کو لکھ لیں اور آپ مجلس میں بیٹھ کر ہماری باتیں سنیں، کوئی سوال نہ کریں۔ جب آپ کی مدتِ قیام کے تین دن رہ جائیں اس وقت یاد دلائیں تو میں آپ کو سوالات کا مستقل وقت دوں گا اور یہ بھی فرمایا کہ جو

سوالات آپ لکھ کر رکھیں گے، اس عرصہ میں کسی سوال کا جواب سمجھ میں آجائے تو اس کو کاٹ دیں۔

ان صاحب نے ایسا ہی کیا اور جب رخصت سے تین روز پہلے حضرتؒ نے سوالات کا وقت دیا تو انھوں نے بتلایا کہ میرے سوالات کی بہت طویل فہرست تھی مگر دورانِ قیام اکثر سوالات کے جواب خود سمجھ میں آگئے، ان کو کاٹتا رہا۔ اب صرف چند سوال باقی ہیں چنانچہ یہ سوالات انھوں نے پیش کیے اور حضرتؒ سے ان کے جوابات پاکر ہمیشہ کے لیے مطمئن ہوگئے۔(۴۰)

مخالفین سے سلوک

۳۵- اکابر دیوبند کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے مخالف مسلک والوں سے بھی بداخلاقی کا برتاؤ نہیں کرتے تھے نہ ان کی تردید میں دلآزار اسلوب کو پسند کرتے تھے اور نہ طعن آمیز القاب سے یاد کرنا پسند کرتے تھے بلکہ جہاں تک ہوسکتا بداخلاقی کا جواب خوش خلقی سے دیتے اور مخالفین کی دینی ہمدردی و خیرخواہی کو پیش نظر رکھتے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے خادمِ خاص حضرت امیر شاہ خان صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مولاناؒ خورجہ تشریف لائے اور وہاں ایک مجلس میں مولوی فضل رسول بدایونی کا تذکرہ چل گیا (چونکہ وہ مخالف مسلک کے تھے اس لیے) میری زبان سے (طنز کے طور پر) بجائے فضل رسول کے فصل رسول نکل گیا۔ مولاناؒ نے ناخوش ہوکر فرمایا کہ "لوگ ان کو کیا کہتے ہیں"؟ میں نے کہا "فضل رسول" آپ نے فرمایا "تم فصل رسول کیوں کہتے ہو"؟ حضرت تھانویؒ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"یہ حضرات تھے جو لا تلمزوا انفسکم ولا تنابزوا بالالقاب کے پورے عامل تھے حتیٰ کہ مخالفین کے معاملہ میں بھی۔" (۴۱)

۳۶- بریلی کے مولوی احمد رضا خاں صاحب نے اکابر دیوبند کی تکفیر اور ان پر سبّ وشتم کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ ہر پڑھے لکھے انسان کو معلوم ہے، ان فرشتہ خصلت اکابر پر گالیوں کی بوچھاڑ کرنے میں انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی لیکن حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس دشنام طرازی کا سب سے بڑا نشانہ تھے، ایک روز اپنے شاگردِ رشید حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ اُن کی تصنیفیں ہمیں سنادو۔ حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ نے عرض کیا کہ "حضرت! ان میں تو گالیاں ہیں۔" اس پر حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا:

"اجی دُور کی گالیوں کا کیا ہے؟ پڑی (یعنی بلا سے) گالیاں ہوں، تم سناؤ۔ آخر اس کے

دلائل تو دیکھیں، شاید کوئی معقول بات ہی لکھی ہو تو ہم ہی رجوع کرلیں۔'' (۴۲)

اللہ اکبر! یہ ہے حق پرستوں کا شیوہ، کہ مخالفین بلکہ دشمنوں کی باتیں بھی، اُن کی دُشنام طرازیوں سے قطع نظر، اس نیت سے سنی جائیں کہ اگر اس سے اپنی کوئی غلطی معلوم ہو تو اس سے رجوع کرلیا جائے۔

۳۷- مولانا محمود صاحب رام پوریؒ (جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے) فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ میں اور ایک ہندو تحصیل دیوبند میں کسی کام کو گئے میں حضرت شیخ الہندؒ کے یہاں مہمان ہوا اور وہ ہندو بھی اپنے بھائیوں کے گھر کھانا کھا کر میرے پاس آگیا کہ میں بھی یہاں ہی رہوں گا، اس کو ایک چارپائی دے دی گئی۔ جب سب سوگئے تو رات کو میں نے دیکھا کہ مولاناؒ زنانہ میں تشریف لائے، میں لیٹا رہا اور یہ سمجھتا تھا کہ اگر کوئی مشقت کا کام کریں گے تو میں امداد کروں گا ورنہ خواہ مخواہ اپنے جاگنے کا اظہار کرکے کیوں پریشان کروں میں نے دیکھا مولاناؒ اس ہندو کی طرف بڑھے اور اس کی چارپائی پر بیٹھ کر اس کے پاؤں دبانے شروع کیے۔ وہ خرّاٹے لے کر خوب سوتا رہا۔ مولانا محمود صاحب کہتے ہیں کہ میں اُٹھا اور عرض کیا کہ حضرت! آپ تکلیف نہ کریں، میں دباؤں گا مولاناؒ نے فرمایا کہ تم جاکر سوؤ، یہ میرا مہمان ہے، میں ہی اس خدمت کو انجام دوں گا۔ مجبوراً میں چپ رہ گیا اور مولاناؒ اس ہندو کے پاؤں دباتے رہے۔ (۴۳)

۳۸- مولانا احمد حسن صاحب پنجابی مدرّس کانپور نے ''ابطالِ امکانِ کذب'' میں ایک مبسوط رسالہ تحریر کرکے شائع کیا جس میں حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ہم عقیدہ حضرات کو فرقۂ ضالہ مزداریہ میں (جو معتزلہ میں سے ایک گروہ ہے) داخل کردیا اور اس پر تقریظ لکھنے والوں نے تو اکابر دین کی نسبت زبان درازی کی انتہا کردی۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ رسالہ دیکھ کر طیش تو بہت آیا لیکن علم وتقویٰ کا مقام بلند ملاحظہ فرمایئے کہ غیظ وغضب کے جذبات کو پی کر ارشاد فرمایا:

''ان گستاخ لوگوں کو بُرا کہنے سے تو اکابر کا انتقام پورا نہیں لیا جاسکتا، اور ان کے اکابر کی نسبت کچھ کہہ کر اگر دِل ٹھنڈا کیا جائے تو وہ لوگ معذور وبے قصور ہیں۔'' (۴۴)

۳۹- حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے مواعظ سے امت کو جو بے مثال نفع پہنچا وہ محتاجِ بیان نہیں۔ حضرتؒ کے مواعظ کا فیض آج تک جاری ہے اور جن حضرات نے ان کا مطالعہ کیا ہو وہ جانتے ہیں کہ یہ مواعظ دین کی بیشتر ضروریات پر حاوی ہیں اور اصلاح وتربیت کے لیے بے نظیر تاثیر رکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ جونپور میں آپ کا ایک وعظ ہونا تھا۔ وہاں بریلوی حضرات کا خاصا مجمع تھا، آپ کے پاس ایک بے ہودہ خط پہنچا جس میں چار باتیں کہی گئی تھیں ایک تو یہ کہ تم جُلا ہے ہو دوسرے یہ کہ جاہل ہو، تیسرے یہ کہ کافر ہو۔ اور چوتھے یہ کہ سنبھل کر بیان کرنا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے وعظ شروع کرنے سے پہلے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اس قسم کا ایک خط میرے پاس آیا ہے پھر وہ خط سب کے سامنے پڑھ کر سنایا اور فرمایا کہ ”یہ جو لکھا ہے کہ تم جلاہے ہو، تو اگر میں جلاہا ہوں بھی تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ میں یہاں کوئی رشتے ناتے کرنے تو آیا نہیں، احکامِ الٰہی سنانے کے لیے حاضر ہوا ہوں، سو اس کو قومیت سے کیا علاقہ؟ دوسرے یہ چیز اختیاری بھی نہیں، اللہ تعالیٰ نے جس کو جس قوم میں چاہا پیدا فرمادیا، سب قومیں اللہ تعالیٰ ہی کی بنائی ہوئی ہیں اور سب اچھی ہیں اگر اعمال و اخلاق اچھے ہوں۔ یہ تو مسئلہ کی تحقیق تھی۔ رہی واقعہ کی تحقیق سو مسئلہ کی تحقیق کے بعد واقعہ کی تحقیق کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی لیکن پھر بھی اگر کسی کو تحقیق واقعہ کا شوق ہی ہو تو میں آپ کو اپنے وطن کے عمائد کے نام اور پتے لکھوائے دیتا ہوں، ان سے تحقیق کرلیجیے، معلوم ہوجائے گا کہ میں جلاہا ہوں یا کس قوم کا؟ اور اگر مجھ پر اطمینان ہو تو میں مطلع کرتا ہوں کہ میں جلاہا نہیں ہوں۔ رہا جاہل ہونا، اس کا البتہ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں جاہل بلکہ اجہل ہوں لیکن جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا ہے اور کتابوں میں دیکھا ہے اس کو نقل کردیتا ہوں۔ اگر کسی کو کسی بات کے غلط ہونے کا شبہ ہو اُس پر عمل نہ کرے۔ اور کافر ہونے کو جو لکھا تو اس میں زیادہ قیل وقال کی حاجت نہیں، میں آپ صاحبوں کے سامنے پڑھتا ہوں:

اشهد أن لا إله إلا الله و أشهد أن محمّد رسول الله (صلى الله عليه وسلم)

اگر میں نعوذ باللہ کافر تھا بھی تو لیجیے اب نہیں رہا۔ آخر میں سنبھل کر بیان کرنے کی دھمکی دی گئی ہے، اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ وعظ گوئی کوئی میرا پیشہ نہیں ہے، جب کوئی بہت اصرار کرتا ہے تو جیسا کچھ مجھے بیان کرنا آتا ہے بیان کردیتا ہوں، اگر آپ صاحبان نہ چاہیں گے تو میں ہرگز بیان نہ کروں گا۔ رہا سنبھل کر بیان کرنا تو اس کے متعلق صاف صاف عرض کیے دیتا ہوں کہ میری عادت خود ہی چھیڑ چھاڑ کی نہیں ہے، قصداً کبھی کوئی ایسی بات نہیں بیان کرتا جس میں کسی گروہ کی دل آزاری ہو یا فساد پیدا ہو، لیکن اگر اصول شرعیہ کی تحقیق کے ضمن میں کسی ایسے مسئلہ کے ذکر کی ضرورت ہی پیش آجاتی ہے جس کا رسوم بدعیہ سے تعلق ہے تو پھر میں رُکتا بھی نہیں، اس لیے کہ یہ صریح دین میں خیانت ہے۔ سب باتیں سننے کے بعد اب بیان کے متعلق جو آپ صاحبوں کی رائے ہو اس سے مطلع کردیا جائے۔ اگر اس وقت کوئی بات کسی کے خلافِ طبع بیان کرنے لگوں تو

فوراً مجھ کو روک دیا جائے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر کوئی ادنیٰ شخص بھی مجھے روک دے گا تو میں اپنے بیان کو فوراً منقطع کردوں گا اور بیٹھ جاؤں گا۔ بہتر تو یہ ہے کہ وہی صاحب روک دیں جنھوں نے یہ خط بھیجا ہے یا اگر خود کہتے ہوئے انھیں شرم آئے یا ہمت نہ ہو تو چپکے سے کسی اور ہی کو سکھلا پڑھا دیں، ان کی طرف سے وہ مجھے روک دیں۔

یہ سن کر ایک معقولی مولوی صاحب جو بدعتی خیال کے تھے اور جن کا وہاں بہت اثر تھا، کڑک کر بولے: ''یہ خط لکھنے والا کوئی حرام زادہ ہے، آپ وعظ کہیے آپ کیسے فاروقی ہیں''؟ حضرتؒ نے فرمایا: ''میں ایسی جگہ کا فاروقی ہوں جہاں کے فاروقیوں کو یہاں کے لوگ جلاہے سمجھتے ہیں۔''

جب سارا مجمع خط لکھنے والے کو برا بھلا کہنے لگا، خاص طور سے وہ مولوی صاحب فحش فحش گالیاں دینے لگے تو حضرت والاؒ نے روکا کہ ''گالیاں نہ دیجیے، مسجد کا تو احترام کیجیے''۔ پھر حضرت والاؒ کا وعظ ہوا اور بڑے زور شور کا وعظ ہوا۔ اتفاق سے دورانِ وعظ میں بلا قصد کسی علمی تحقیق کے ضمن میں کچھ رسوم وبدعات کا بھی ذکر چھڑ گیا پھر تو حضرت والاؒ نے بلا خوفِ لومۃ لائم خوب ہی ردّ کیا، لوگوں کو یہ اختیار دے چکے تھے کہ وہ چاہیں تو وعظ کو روک دیں، لیکن کسی کی ہمت نہ ہوئی۔

وہ معقولی مولوی صاحب شروع شروع میں تو بہت تحسین کرتے رہے اور بار بار سبحان اللہ سبحان اللہ کے نعرے بلند کرتے رہے، کیونکہ اس وقت تصوف کے رنگ پر بیان ہورہا تھا لیکن جب ردّ بدعات ہونے لگا تو پھر چپ ہوگئے مگر بیٹھے سنتے رہے، یہ بھی خدا کا بڑا فضل تھا کیونکہ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ ایسے کٹر اور سخت ہیں کہ جہاں کسی واعظ نے کوئی بات خلافِ طبع کہی، انھوں نے وہیں ہاتھ پکڑ کر منبر سے اتار دیا، لیکن اس وقت انھوں نے دم نہیں مارا، چپکے بیٹھے سنتے رہے۔ لیکن جب وعظ ختم ہوا اور مجمع رخصت ہونے کے لیے کھڑا ہوگیا تو اُس وقت اُن مولوی صاحب نے حضرت والاؒ سے کہا کہ ''ان مسائل کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی''؟ اس پر ایک دوسرے ذی اثر مولوی صاحب (جو خود بدعتی خیال کے تھے) بڑھے اور جواب دینا چاہا لیکن حضرت والاؒ نے انھیں روک دیا کہ خطاب مجھ سے ہے، آپ جواب نہ دیں، مجھے عرض کرنے دیں پھر حضرت والاؒ نے اُن معقولی مولوی صاحب سے فرمایا کہ ''آپ نے یہ بات پہلے مجھ سے نہ فرمائی، ورنہ میں احتیاط کرتا، میں نے تو جو کچھ بیان کیا ضروری ہی سمجھ کر کیا، مگر اب کیا ہوسکتا ہے؟ اب تو بیان ہوچکا۔ ہاں! ایک صورت اب بھی ہوسکتی ہے وہ یہ کہ ابھی تو مجمع موجود ہے، آپ پکار کر کہہ دیجیے کہ صاحبو! اس بیان کی کوئی ضرورت نہ تھی، پھر میں آپ کی تکذیب نہ کروں گا اور آپ ہی کی بات اخیر رہے گی۔'' اس پر سب لوگ ہنس پڑے اور مولوی صاحب وہاں سے رخصت ہوگئے۔

اُن کے چلے جانے کے بعد سب لوگ اُن کو برا بھلا کہنے لگے، جب بہت شورغل ہوا تو حضرت والاؒ نے کھڑے ہوکر فرمایا کہ ''صاحبو! ایک پردیسی کی وجہ سے آپ مقامی علماء کو ہرگز نہ چھوڑیں، میں آج مچھلی شہر جارہا ہوں۔ اب آپ صاحبان یہ کریں اور میں ان صاحب کو بالخصوص خطاب کرتا ہوں جنھوں نے خط بھیجا ہے کہ وہ میرے بیان کا رد کرادیں پھر دونوں راہیں سب کے سامنے ہوں گی جو جس کو چاہے اختیار کرے، فسادکی ہرگز ضرورت نہیں''۔ پھر ان دوسرے مولوی صاحب نے (جو بدعتی خیال کے ہونے کے باوجود حمایت کے لیے آگے بڑھے تھے) کھڑے ہوکر فرمایا کہ:

''صاحبو! آپ جانتے ہیں کہ میں مولودیہ بھی ہوں، قیامیہ بھی ہوں مگر انصاف اور حق یہ ہے کہ جو تحقیق آج مولوی صاحب نے بیان فرمائی ہے صحیح وہی ہے۔'' (۴۵)

۴۰- احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے سنا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے متعلقین میں سے کسی صاحب نے اہل بدعت کی تردید میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ اہل بدعت نے اس کا جو ردّ لکھا، اس میں انھیں کافر قرار دیا۔ اس عمل کے جواب میں ان صاحب نے دو شعر کہے:

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست ❁ چراغِ کذب رانبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش ❁ دروغے را جزا باشد دروغے (۴۶)

انھوں نے حضرت شیخ الہند کو یہ شعر سنائے تو آپ نے شعری لطافت کی تو تعریف فرمائی لیکن ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ ''تم نے اُن کو لطافت کے ساتھ ہی سہی، کافر تو کہہ دیا حالانکہ فتویٰ کی رُو سے وہ کافر نہیں ہیں اس لیے ان اشعار میں اس طرح ترمیم کرلو۔

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست
چراغِ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش
دہم شکر بجائے تلخ دوغے
اگر تو مؤمنی فبہا ، و اِلاّ
دروغے را جزا باشد دروغے (۴۷)

یہ چند واقعات ہیں جو کسی خاص اہتمام اور تحقیق وجستجو کے بغیر زیرِقلم آگئے۔ اس مختصر مضمون میں اس قسم کے واقعات کا احاطہ مقصود نہیں۔ اگر کوئی بندۂ خدا مزید تحقیق وجستجو اور مطالعہ کے بعد ان

حضرات کے ایسے واقعات کو یکجا کردے تو علم و دین کی بڑی خدمت ہو لیکن مذکورہ چند واقعات اکابر دیوبند کے حسن و جمال کی ایک جھلک دکھانے کے لیے، اُمید ہے کافی ہوں گے۔ وللہ الحمد اولاً وآخراً۔

حواشی:

(۳۷) مجالس حکیم الامت، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب، ص:۵۸۔

(۳۸) مجالس حکیم الامت: حضرت مفتی محمد شفیع صاحب، ص:۶۰-۶۲۔

(۳۹) ارواح ثلاثہ، ص:۱۷۵، نمبر ۲۲۸۔

(۴۰) ارواحِ ثلاثہ، ص:۲۱۱، نمبر ۳۰۸۔

(۴۱) ارواحِ ثلاثہ، ص:۲۸۵، نمبر ۴۳۲۔

(۴۲) حیات شیخ الہندؒ از حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ، ص:۱۸۳۔

(۴۳) اشرف السوانح، ج:۱، ص:۶۸-۷۲۔

(۴۴) تم نے مجھے کافر کہا مجھے اس کا غم نہیں کیونکہ جھوٹ کا چراغ جلانہیں کرتا۔ میں اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہوں گا، کیونکہ جھوٹ کی سزا جھوٹ ہی ہوسکتی ہے۔''

(۴۵) ''تم نے مجھے کافر کہا، مجھے اس کا غم نہیں کیونکہ جھوٹ کا چراغ جلانہیں کرتا، میں اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہوں گا اور تلخی کا جواب شیرینی سے دوں گا، اگر تم واقعی مومن ہو تو خیر ورنہ جھوٹ کی سزا جھوٹ ہی ہوسکتی ہے۔''